غلیظ عورت

ماہم حیاء صفدر

اک فسانہ ہے زندگی لیکن
کتنے عنوان ہیں اس فسانے میں

چاک داماں کی خیر ہو یا رب
ہاتھ گستاخ ہیں زمانے کے

وہ گزشتہ رات سے اپنے تین سال کے میلے کچیلے بچے کو گود میں لیے ''مجید کریانہ اسٹور'' کے تھڑے پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اس کے پیٹ میں کل سے روٹی کا ایک نوالہ تک نہیں گیا تھا۔ بچہ بھوک کے مارے روتا تو وہ بھی بلکنے لگتی۔ آج جمعہ تھا اور زیادہ تر دکانیں بند تھیں۔ لاک ڈاؤن کے پیش نظر، چند دکانیں مخصوص وقت پر کھلتیں اور بند ہو جاتیں۔ اسی دوران یہاں آنے والوں کے سامنے اپنے سانولے ہاتھ کی مرجھائی ہوئی ہتھیلی پھیلاتے ہوئے اس کا دن گزر جاتا۔ کوئی فراخ دل شخص صدقہ خیرات دے جاتا تو اس کا اور اس ننھے وجود کا پیٹ سکون سے بھر جاتا۔

زندگی بڑی بے درد ہے۔ سال پہلے تک اس نے بھی خوشیوں بھرا دور دیکھا تھا۔ اس کا شوہر ایک مل میں مزدور تھا، کرونا کی وبا نے جہاں ڈھیر سارے گھروں کے چولہے ٹھنڈے کیے وہیں گل شیر کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو گیا تھا۔ مالک مکان نے اس بے چاری بیوہ کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ زہرہ کے اپنے بہن بھائی نہ تھے جبکہ شوہر کے بہن بھائی اس برے وقت میں انجان بن گئے تھے۔ اس نے ایک سہیلی کے ہاں چند دن گزارے۔ ایک دن کام کی تلاش میں نکلی کہ کب تک اس بے چاری پر بوجھ بنی رہے گی مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے، ایک گاڑی سے ٹکرا گئی۔ اس حادثے نے اسے ایک ٹانگ سے محروم کر دیا۔ ایک اپاہج، بے سہارا اور لاوارث عورت کو کون اپنے گھر میں رکھتا؟ سہیلی کے گھر کے حالات بھی شکستہ تھے سو ایک دن اس نے بھی ہاتھ جوڑ کر مزید مدد سے معذرت کر لی تھی۔ ایک احسان یہ کیا کہ زہرہ کو اس بازار تک چھوڑ دیا تھا۔

تب سے یہی بازار اس کا گھر بن گیا تھا۔ مجید میاں دیکھنے میں بھلے آدمی لگتے تھے تب ہی تو اپنی دکان کے تھڑے پہ، سبز شیڈ کے نیچے اسے دن رات بسر کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کبھی کبھار کھانے کو بھی کچھ دے دیتے تھے مگر کل وقتی ذمہ داری کون لیتا؟ ایسے حالات میں جب دکان زیادہ تر بند رہتی اور اکا دکا گاہک آتے تھے، ان کے اپنے اخراجات بھی حد سے سوا تھے۔ جب درد شکم اپنی انتہا کو پہنچتا تو وہ ایک ٹانگ

www.zemtime.com

پر گھسٹتی ہوئی ہر آتے جاتے کے سامنے ہاتھ پھیلاتی، کچھ ترس کھا کر ہمدردی سے اس کے ہاتھ پر رکھ جاتا تو کوئی کم ظرف ایسی نفرت بھری گھوری سے نوازتا کہ اس کا کلیجہ تک کٹ کے رہ جاتا۔

اس کا حلیہ ہی اتنا کریہہ تھا کہ دیکھنے والوں کو متلی ہو جاتی۔ الجھے بال جو مہینوں سے کنگھی کی نعمت سے محروم تھے، سانولا رنگ، جو گردش حالات کے باعث سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ اجڑی آنکھیں، پھٹے پرانے کپڑے، جسم پر میل کی دبیز تہیں کہ نہانے کی مشقت کیوں نہ ہو؟ کبھی بارش ہوتی تو وہ گھسٹ کے باران رحمت سے بدن بھگو لیتی۔ ساتھ ہی ساتھ بچے کو بھی یہ کھلا غسل دے دیتی۔

یہ دنیا ''کچھ دو اور کچھ لو'' کے اصول پہ چلتی ہے۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو قدرے بہتر حالت میں تھی۔ وقت نے ابھی اس کے نقوش کے ٹانکے یوں نہیں ادھیڑے تھے۔ تنہا عورت تو آج کے زمانے میں گھر بیٹھی بھی محفوظ نہیں کجا یوں بازاروں میں پڑی ہو۔ ہوس کے بچاریوں کو تو یوں بھی رنگ روپ، مکمل و ناقص وجود سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ انہیں تو اپنے نفس کی لمبی زبان پر وقتی تسکین کے کچھ قطرے ٹپکانے کو ایک موقع ملنا ہی کافی ہوتا ہے۔ یہ ''محفوظ'' پناہ گاہ بھی اسے یونہی تھوڑی نصیب ہوئی تھی۔ اس کے مالک نے بھی اپنی مرضی کا تاوان وصول کیا تھا۔ یہ ایسا تاوان تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ایسا قفل پڑا کہ اس کے بعد ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا تھا۔

ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہوتی ہے۔ اسے جینے کی آرزو رہی ہی کب تھی؟ وہ تو بس اس ننھے سے وجود کی خاطر سانس لینے کی مشقت سے گزر رہی تھی۔

ایک گاڑی اس کے سامنے آ کر رکی۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ صاحب اور سرخ ساڑھی میں لپٹی خوب صورت

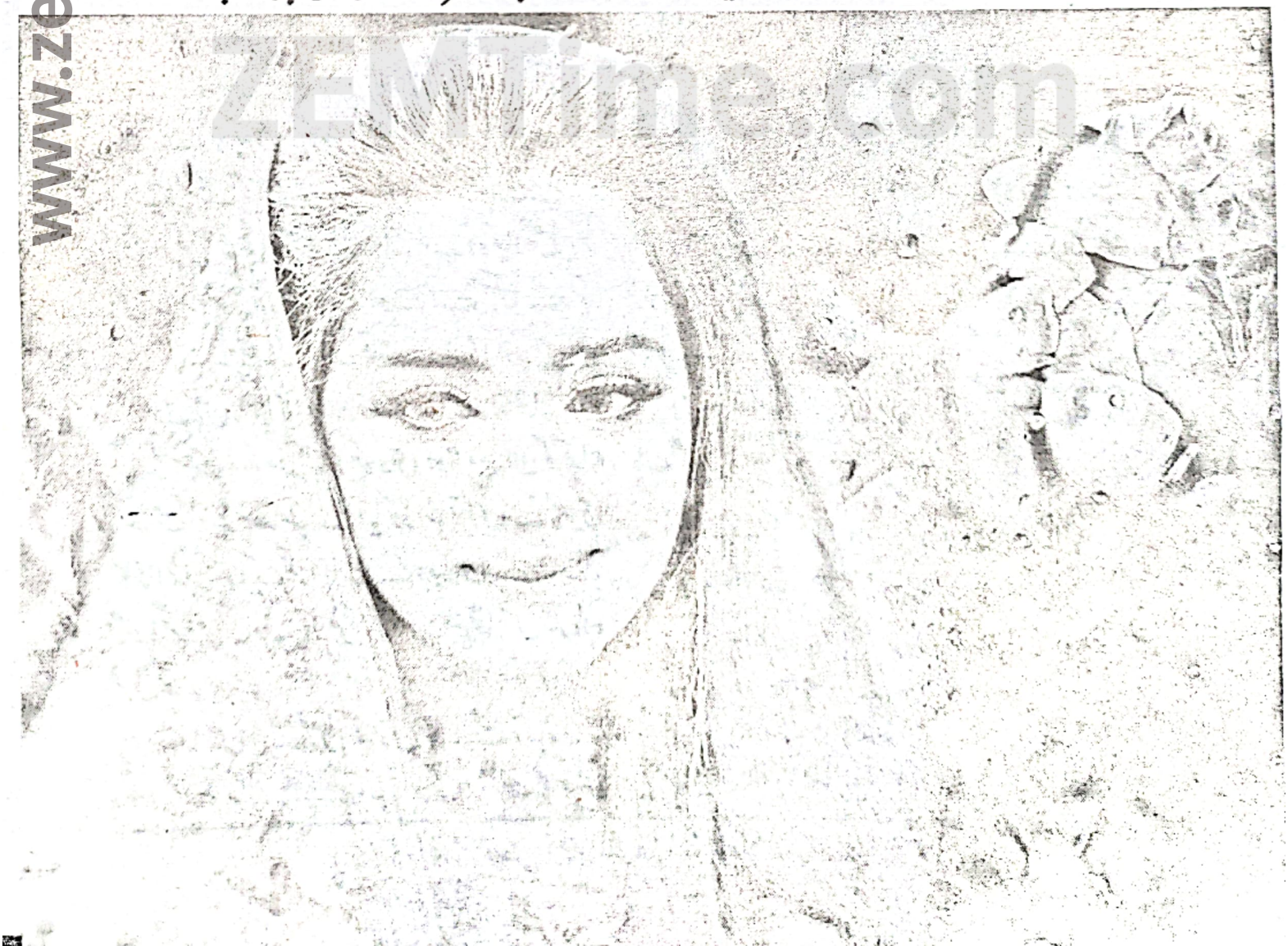

www.zemtime.com

عورت مسکرا کے اترے اور دکان سے کچھ فاصلے پر بنے ریسٹورنٹ کی طرف ہو لیے۔ ریسٹورنٹ کی سٹنگ ارینجمنٹ سڑک کنارے آؤٹ ڈور تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ سے ایک آیا پانچ سالہ بچے کو لے کر اتری اور اسی سمت چل دی۔ وہ صاف ستھرا بچہ دلچسپی سے اس کی گود میں لیٹے سوکھے سڑے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر آنسوؤں کے مٹے مٹے نشان تھے اور وہ اسے یوں بھینچے ہوئے تھی گویا اس کے کھو جانے کا خوف ہو۔

''وجدان..... کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس عورت نے بچے کو ٹوکا تو اس نے انگلی سے سامنے اشارہ کیا۔

''وجی..... نہیں، نہیں دیکھو اس طرف۔'' عورت نے گھبرا کے کہا۔

''کیوں مما؟'' بچے نے سوال کیا۔

''دیکھو وہ کتنی غلیظ عورت ہے، آخ تھو..... غلیظ عورتوں کی طرف نہیں دیکھتے۔'' اس نے کراہیت سے کہا اور پزا کا ایک ٹکڑا پلیٹ میں ڈال کے اس کے سامنے رکھ دیا۔

ایک راہ گیر اس بھکارن کی جھولی میں گلے سڑے دو کیلے پھینک گیا جو اس نے جلدی سے جھپٹ لیے اور بچے کا چہرہ تھپتھپا کے اسے اٹھایا۔ اب وہ کیلا چھیل کر اس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اسے مسکرا کے دیکھ رہی تھی۔ بچے نے ایک قلقاری ماری اور اس کی آنکھوں میں مامتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔

''سکینہ..... منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ وجدان کو کھانا کھلاؤ۔'' میڈم صاحبہ نے آیا کو ڈانٹا تو اس نے چھری کانٹا اٹھایا اور ایک ٹکڑا کاٹ کے وجدان کے منہ سے لگا دیا مگر اس کی دلچسپی کا مرکز تو وہی منظر تھا جس میں وہ غرق تھا۔

''مما میں ایسے نہیں کھاؤں گا۔ مجھے آپ کے ہاتھوں سے کھانا ہے، مجھے آپ کھلاؤ۔'' اس نے چمکتی آنکھوں سے کہا اور کانٹا پرے ہٹا دیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے وجدان؟ بی ہیو یور سیلف، تمیز سے کھانا کھاؤ۔'' اس نے بچے کو آنکھیں دکھائیں اور شوہر سے باتیں کرنے لگی۔ وہ اسے یکسر فراموش کیے بیٹھے تھے۔

''مما مجھے آپ کھلائیں۔'' وہ ہنوز ضد پہ اڑا رہا۔

''سکینہ کھلا رہی ہے ناں۔'' وہ مصروف سے انداز میں کہہ کر پھر شوہر سے بات کرنے لگی۔

''مما میں نے کہا ناں مجھے آپ کے ہاتھ سے کھانا ہے۔'' بچہ قدرے چیخا اور ماں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پہ رسید کر دیا۔

''کیا ہو گیا ہے؟ ریلیکس۔'' شوہر نے اس کو شانے سے پکڑا اور بیٹے کو مخاطب کیا۔

''وجدان اسی لیے ہم آپ کو ساتھ نہیں لاتے، تم بہت پریشان کرتے ہو، چلو شاباش اب تنگ نہیں کرو اور آرام سے کھانا کھاؤ۔''

''مما کاش آپ بھی اس کی طرح غلیظ عورت ہوتیں۔'' وجدان نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے اپنی حسرت کا اظہار کیا۔ وہ غلیظ عورت صرف ماں تھی جو اپنے بچے کو اپنے ہاتھ سے نوالہ کھلا رہی تھی۔ میک اپ سے لٹی پھٹی اس کی ماں سے کہیں بہتر۔

اس کا ننھا سا ذہن بس یہی سوچ رہا تھا کاش میری ماں بھی غلیظ ہوتی۔

www.naeyufaq.com

www.zemtime.com